© rasailojaraid.com

گذرنا ہے تک بڑی غلطی ہے

فرد :

آغاز :

چیست شاکی از حیرانی
دمبدم نالہ را بگی رانی

رباعیات :-

حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں ، آغاز :

ای گشتہ عیاں از رخت انوار ہدا
بگذار کہ بینم مہ رویت بخدا

ترجیع بند :- آغاز :

ما ناطق سر قل کفا ئیم
تفسیر کلام کبریا ئیم

قصیدہ (چھ قصیدے)

پہلے قصیدے کا آغاز اس طرح ہے۔

دوش این ندا بگوش من آمد دم سحر
کامی بی خبر قضائی تو می گوید این قدر

مثنوی (دو مثنویاں) :

پہلی تین مثنویوں میں شاعر کے متعلق، خیمہ دوزی اور حلوا گری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصطلاحوں کو بیان کیا ہے۔ ساتویں مثنوی عشق نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ آٹھویں مثنوی زیادہ تر شہنشاہ اکبر کی مدح میں ہے۔

پہلی مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

کریما کارساز ہر دو سرا
رحیما شفیقا پروردگارا

حواشی

۱۔ ابوالفضل، آئین اکبری ص۲۱ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۳ء۔

۲۔ کیٹلاگ پرشین مینوسکرپٹس، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ جلد دوم ص ۱۶۳-۱۶۹۔

(ختم شد)

گلِ رعنا

(از برج لال رعنا جگی)

اردو رباعیوں کا دلکش مجموعہ، جس کے متعلق حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مراد آبادی، حضرت فراق گورکھپوری وغیرہ نے اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

جگر مراد آبادی، رعنا صاحب کو ایک فطری شاعر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

صفحات: ۲۳۲　　قیمت: ۲۰ روپے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوموں کا عروج وزوال

اسباب وعلل کی روشنی میں

(جناب عبدالمتین صاحب دہلی)

آج کل جو تاریخی کتابیں ہمارے سامنے ہیں' ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال سے انسانوں نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی اور اسی دو[ران] دنیائے انسانی میں بہت سی قومیں بام عروج پر پہنچیں۔ اور بہت بڑے علاقے کو تا[بع] کرکے عظیم الشان حکومتیں اور سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ یہی قو[میں] زوال پذیر ہوکر نیست ونابود ہوگئیں۔

ان حقائق نے سائنسدانوں اور اہل فکر حضرات کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ اسباب وعلل کا جائزہ لیں، جنکی وجہ سے یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چنانچہ بہت سے مفکرین اور فلسفیوں نے ان اسباب سے بحث کی ہے۔ اور اپنی معلومات کی روشنی میں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے چار مفکر آج کی علمی دنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اور واقعی ان کے تجزیے بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔

اس مضمون میں انہیں مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چودھویں صدی کا مشہور ترین فلسفی مورخ ابن خلدون[1] کا کہنا ہے کہ قوموں کا عروج و ترقی محض اختیار پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود و ترقی کے ہر مرحلے میں معنوی رشتوں سے منسلک اور وابستہ رہتے ہیں[2] اور یہ معنوی رشتے ایک ایسے جذبے سے پیدا ہوتے ہیں جسے ابن خلدون عصبیت کا نام دیتا ہے[3] جس سے مراد وہ قوت ہے جو کسی گروہ یا قوم میں محبت، اخوت اور یکجہتی کے شدید احساس پیدا کرتی ہے۔

جب تک جذبۂ عصبیت کسی قوم میں توانا رہتا ہے اس وقت تک قوم ترقی و عروج کی منزلیں طے کرتی ہے۔ لیکن مختلف عوامل کی بنیاد پر جب یہ جذبہ کمزور ہو جاتا ہے تو قوم روبزوال ہو جاتی ہے۔ اور جوں جوں یہ اتحادی جذبہ انتشاری قوت میں بدلتا جاتا ہے قوم فرقہ بندیوں کا افسانہ بن کر تباہ ہو جاتی ہے۔

---

[1]:- ابن خلدون (پ ۱۳۳۲ء م ۱۴۰۶ء) شمالی افریقہ کے ملک تیونس میں ایک عرب خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ ایسا جامع الکمالات انسان تھا کہ مختصر عرصے میں بحیثیت وزیر، جج اور ماہر اسلامیات کے آفاقی شہرت حاصل کر لی اور آخر عمر میں اس نے اپنی معلومات و تجربات کی روشنی میں ایک نہایت ہی بصیرت افروز کتاب لکھی جس کا پہلا حصہ مقدمہ ابن خلدون، کے نام سے بہت مشہور رہا اور یورپ نے اس سے فائدہ اٹھا کر مختلف علوم کی بنیاد رکھی ہے کہ علم الاجتماع یا علم فلسفہ تاریخ وغیرہ

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ابن خلدون نے بلاواسطہ صرف مغربی مسلم قوموں اور سلطنتوں کا مطالعہ کیا تھا اسی لئے اس کے تجزیئے میں ان قوموں کی فکری اور عملی مظاہر کی جھلک ہے اور یہی چیز سامنے رہنی چاہیے کہ اس دور کا سماج جاگیردارانہ تھا جس میں آمدنی کا اصل ذریعہ زمین اور زراعت ہوتی ہے۔

[2]:- ڈاکٹر بشارت علی۔ مقدمہ ابن خلدون (اردو ترجمہ) کا پیش لفظ۔ ص ۸۹

[3]:- ابن خلدون۔ مقدمہ ابن خلدون (اردو ترجمہ) ص ۳۶۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھارویں صدی کا مشہور ترین جرمن فلسفی ایمانوئل کانٹ کا خیال ہے کہ (۱) انسانوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں اور ایک دوسرے کی مدد کریں وغیرہ اسی خواہش کو انسان کا معاشرتی رجحان کہا جاتا ہے۔

لیکن حضرت انسان کی تضاد پرست طبیعت میں ایک ایسا رجحان بھی ہے جو معاشرتی رجحان کی نفی کرتا ہے کیونکہ انسان علیحدہ بھی رہنا چاہتا ہے اور اسی جبلت انفرادیت کا بھی جذبہ ہے اور بعض حساس اہل فکر ایسے بھی ہوتے ہیں جو معاشرے کے اقدار سے مطمئن نہیں ہوتے اور معاشرے کی سب الجھنوں اور ناہمواریوں سے مفاہمت نہیں کرتے اور بعض افراد جو اپنی فکری صلاحیتوں اور پیہم کاوشوں کی وجہ سے علم و فن

ـــــہ امانوئیل کانٹ (۱۷۲۴ - ۱۸۰۴ء) مشہور جرمن فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا ذاتی زندگی اتنی با اصول تھی کہ اسے لوگ "مشین" کہا کرتے تھے عورت اور موسیقی سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کونگس برگ یونیورسٹی میں منطق اور مابعد الطبیعیات کا پروفیسر مقرر ہوا (اردو دائرۂ انسائیکلوپیڈیا لاہور، ۱۹۶۸ء ص ۱۱۴۲) مجموعی طور پر کانٹ فلسفی زیادہ اور مورخ کم ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق جرمنی سے تھا جو یورپ کے جدید فلسفیانہ اور سائنٹفک نظریات کا تصورات کا منبع ہے اور صنعتی دور کا ایسا علاقہ ہے جس نے دورِ جدید کے نشیب و فراز کا سب سے زیادہ مقابلہ کیا ہے۔ صنعتی دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسی آمدنی کا اصل ذریعہ مصنوعات اور تجارت ہوتی ہے کانٹ نے صنعتی دور کا یورپ میں سب سے بڑا فلسفیانہ مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع پر اس کے دو مضامین، عالمی تاریخ کا تصور آفاقی نقطۂ نظر سے اور "دائمی امن"، بہت ہی فکر انگیز ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مقابلہ میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ معاشرے کی غالب اکثریت کم تعلیم یافتہ ہوتی ہے جس وجہ سے ایسے افراد کو معاشرے کی اکثریت سے گھٹن ہوجاتی ہے اور یہ افراد اپنے آپ کو معاشرے میں کسی حد تک اجنبی سمجھنے لگتے ہیں اور معاشرہ بھی درحقیقت میں ان کو اہمیت نہیں دیتا جس کی وجہ سے ان افراد میں معاشرے کے خلاف ایک قسم کی بغاوت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے جو کہ زیادہ تر فکری نوعیت کا ہوتا ہے۔ اسی قسم کی بغاوت یا معاشرے کی مخالفت کا رجحان یوں تو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے، لیکن بعض انسانوں میں مخالفت کا یہ جذبہ زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کی ذہنی تعمیر میں معاشرتی رجحان بھی اور غیر معاشرتی رجحان بھی۔ [1]

کانٹ کہتا ہے کہ ان دو متضاد رجحانات کی کشمکش کی وجہ سے انسان ترقی کرتا ہے اور اگر انسان محض معاشرتی رجحان کے زیر اثر رہتا تو ہمیشہ لکیر کا فقیر رہتا، کوئی نئی بات کبھی پیدا نہ ہوتی کیونکہ ہر نئی بات عام باتوں سے علیحدہ ہوتی ہے ورنہ وہ "نئی" نہ ہوگی، افکار تازہ پیدا نہ ہوتے، سائنسی ایجادات نہ ہوتیں، انسان کھاپی کر مست رہتا اور سست ہوجاتا۔ انسان کے غیر معاشرتی رجحانات، اسے خواب سے بیدار کرتے ہیں اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا کرتے ہیں اور نوع انسانی کی تاریخ ترقی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح اخلاقی قانون کا تقاضا پورا ہوجاتا ہے۔ جو کانٹ کے خیال میں انسان کی تعمیر کی بنیاد ہے۔ [2]

---

[1] ڈاکٹر مرزا افتخار حسین، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور ۱۹۷۶ء صفحات ۱۸۳ - ۱۸۲ -

[2] حوالہ بالا ،، صفحہ ۱۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انیسویں صدی کا مشہور جرمن فلسفی ہیگل ۱ نے فلسفہ تاریخ کے سلسلے میں ایک مشہور نظریہ "نظریہ جدلیت" پیش کیا جس کی رو سے ہر تصور اپنی ضد پیدا کرتا ہے یعنی کسی تصور روشنی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے روشنی کا تصور ظلمت کا بھی ہے۔ کوئی تصور اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جبکہ اس کی ضد بھی موجود ہو۔ اور ہر تصور بڑھ کر اپنی نفی کر لیتا ہے۔ جیسے کہ روشنی ایک حد سے بڑھ کر ظلمت کے مترادف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حد سے بڑھ کر روشنی نظارہ سوز ہوتی ہے۔ اور جب ایک تصور حد سے بڑھ کر اپنی نفی کر لیتا ہے تو یہ ایک نئے تصور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جسے منفی تصور کہہ سکتے ہیں۔ اسی منفی تصور میں پہلے تصور کی صرف ناقص پہلو کی نفی ہوتی ہے۔ جیسے ماں اور بچے کی محبت فطری ہوتی ہے لیکن بچے کی تربیت کے لیے ماں بچے کے ذہن میں خوف کا تصور بھی پیدا کرتی ہے (جو محبت کی ضد ہے) اسی طرح محبت کے تصور نے بڑھ کر اپنی نفی کر لی اور اپنی ضد پیدا کر لی، یعنی مثبت تصور بڑھ کر منفی تصور میں بدل گیا۔ لیکن مثبت تصور یعنی محبت کے تصور کی بالکل نفی نہیں ہوتی بلکہ محبت کے اسی پہلو کی نفی ہوئی جو بچے کے لیے مضر تھا۔ اسطرح مثبت تصور یعنی عمل THESIS اور منفی تصور یعنی ردعمل (ANTI THESIS) مل کر ایک نیا تصور پیدا کر لیتے ہیں جسے اتحاد SYNTHESIS کہا جا سکتا ہے۔ جس میں مثبت تصور اور منفی تصور دونوں کی "یاد" باقی رہتی ہے۔ ش۲

ش۱۔ ہیگل (۱۷۷۰ء – ۱۸۳۱ء) مشہور جرمن عالم اور فلسفی تھا۔ ہیڈل برگ اور برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر رہا۔ اس کا مطالعہ دینیات، تاریخ، فلسفہ، ادب، مابعد الطبیعات اور منطق پر بڑا گہرا تھا۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا، لاہور، ۱۹۶۸ء – صفحہ ۱۵۲۴)

ش۲۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۲۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیگل نے اپنے اسی نظریے کی مدد سے تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی اور کہا کہ تاریخ اتفاقات کے تسلسل سے عبارت ہے۔ تاریخ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اسے مثبت کہا جا سکتا ہے۔ اس واقعے کے اثرات کے مدت گزر جانے سے اس کے خلاف ردعمل ہوا اور اس کی نفی کرنے والا دوسرا واقعہ پیش آیا جسے منفی کہا جا سکتا ہے پھر ان دونوں واقعات مثبت اور منفی سے ایک تیسرا واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح تاریخ کا جدلیاتی عمل جاری رہتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہوا کہ ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب عمل اور ردعمل (مثبت و منفی) جاری رہیں۔ اہم واقعات اسی دور میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جب واقعات کا عمل اور ردعمل شدت اختیار کرتا ہے۔ اور ایک تیسرا اہم واقعہ وجود میں آتا ہے۔

تاریخ کی حرکت ہیگل کی نظر میں کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے کہ جب کوئی قوم ترقی کرتے کرتے ایک منزل پر پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آچکی ہوں تو یہ ایک اہم منزل ہوتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر قانون ضدیت کے تحت نفی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ اسکی تمام صلاحیتیں ابھر کر سامنے آچکیں۔ اور اس نے ایک خاص قسم کا طرز زندگی حاصل کر لیا۔ اب باقی کیا رہا۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم آہستہ آہستہ اپنے طرز زندگی سے اکتا جاتی ہے اور جن قوانین اور اصولوں کے ذریعے اس نے عروج حاصل کیا تھا، وہ اُسے فرسودہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک تاریخی تصور کی نفی ہو جاتی ہے۔[سلہ]

اب دو صورتیں پیش آتی ہیں۔ یا تو قوم اسی نظام زندگی کو فرسودہ قرار دینے کے بعد اس کے خلاف ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہے اس کی خامیاں معلوم کر کے انہیں دور کرتی ہے۔ اس طرح منفی کیے ہوئے تصور کے ردعمل سے ایک نیا تصور یعنی مثبت تصور یا طرز

سلہ۔ حوالہ مذکورہ بالا صفحات ۱۹۶ - ۱۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی پیدا کرتی ہے [illegible] چیز کی طرف [illegible] ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ پرانے نظام کو ہی جوں کا توں برقرار رکھنے کے باوجود اس کے خلاف رد عمل ظاہر کرتی اور اصلاحات پر قناعت کرتی ہے۔ جس سے پرانے نظام کے نقائص باقی رہتے ہیں۔ اور [illegible] تصور منفی ہی رہتا ہے اور ایک لحاظ سے تہذیب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور [illegible] قوم کی بھی۔ [10]

بیسویں صدی کا سب سے مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ ٹوائن بی [11] نے قوموں کے عروج و زوال کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے، اسے چیلنج اور اس کا جواب، کا نظریہ کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ٹوائن بی کے نزدیک یہ ہے کہ انسان تہذیبی منازل اسی وقت طے کرتا ہے، جب اسے کسی چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑے۔ انسان یا قوم اپنے حال میں مگن رہتی ہے۔ لیکن جب کسی شدید مشکلات سے دوچار ہوتی ہے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی و مادی ساز و سامان اکٹھا کر کے چیلنج کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس طرح چیلنج اور اس کا مقابلہ قوم کو سخت جان اور طاقتور بنا دیتے ہیں

---

[10]:۔ حوالہ مذکورہ بالا صفحات ۱۹۷

[11]:۔ آرنلڈ ٹوائن بی (پ ۱۸۸۹ء) برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ لندن یونیورسٹی میں ادبیات اور تاریخ کے پروفیسر رہے۔ بیسویں صدی کے سب سے مشہور اور مستند مورخ مانے جاتے ہیں ان کی شہرۂ آفاق کتاب A STUDY OF HISTORY ہے۔ اس کی بارہ جلدیں ہیں جو دنیا میں پائی جانے والی تمام تہذیبوں پر نہایت عالمانہ تجزیہ و تحلیل پیش کرتی ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید نے مطالعہ تاریخ کے لئے جو نئے تصورات اور طریقے ایجاد کئے ہیں اور چھاپہ خانے وغیرہ کی ایجاد نے مستند اور نادر کتابوں کی فراہمی آسان کر دی ہے۔ ان تمام سہولیات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹوائن بی نے تاریخ کا ایسا وسیع، محققانہ اور مبصرانہ جائزہ لیا ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

© rasailojaraid.com

اور بعض اوقات تہذیب کی ترقی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور تواریخ ہی سے مختلف تہذیبوں کا وجود ہمیں ملتا ہے کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب قوم کو چیلنج کا سامنا نہ رہا۔ تو قوم مطمئن ہو گئی۔ پہلے ترقی کی رفتار کم ہوئی پھر ترقی رک گئی اور پھر قوم رجعت قہقری کی سمت مراجعت کرنے لگی۔ جہاں وہ چیلنج سے پہلے تھی۔۱۲؎

لیکن بعض اوقات چیلنج اسی قدر زبردست ہوتا ہے کہ قوم اس کا مقابلہ کرنے سے ہی ناکام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات چیلنج اسقدر کمزور ہوتا ہے، کہ قوم اسکے زیادہ متاثر نہیں ہوتی۔ اور مقابلہ نہیں کرتی۔ چنانچہ چیلنج اگر بہت سخت ہو یا بہت کمزور تو دونوں صورتوں میں قوم یا تہذیب ترقی نہیں کرتی۔ تہذیب اسی وقت ترقی کر سکتی ہے۔ جب نہ صرف چیلنج کا مقابلہ کامیاب ہو۔ بلکہ یہ کامیابی ایک مزید چیلنج کا پیش خیمہ ثابت ہو اور پھر اس کا مقابلہ کیا جائے اور وہ مقابلہ کامیاب ہو۔ یہ سلسلہ جب تک جاری رہے گا، ترقی ہوتی رہے گی۔ جہاں یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا، ترقی رک جائے گی۔

اور اصل ترقی اس وقت ہوتی ہے۔ جب انسان کی قوتیں مادی اور بیرونی مشکلات پر قابو پانے کے بعد روحانی اور داخلی چیلنج کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور کامیاب ہوتی ہیں۔

اور ہر قوم و معاشرے کی اصل طاقت و حرکت کا سرچشمہ اس کی تخلیقی اقلیت، ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کے زیادہ ذہین اور طباع افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور معاشرے و قوم پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اول یہ کہ یہ نئے افکار کی تخلیق کرتی ہے۔ اور حسب توفیق اختراعات و ایجادات پیش کرتی ہے۔ دوم پھر یہ کوشش کر کے معاشرے

۱۲؎ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۰۸

© rasailojaraid.com

یا قوم کو اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے۔ اس کے بعد قوم بھی ویسا ہی [illegible]
طرح سوچنا شروع کر دیتے ہیں یا کم از کم ان کی ظاہری عادات و اطوار سے متاثر ہو کر
انہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ تخلیقی اقلیت معاشرے کی اصل طاقت بن کر
اکثریت کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور معاشرہ ترقی کے منازل طے کرتا ہے
لیکن جب یہ تخلیقی اقلیت، مسخ ہو جاتی ہے۔ تو معاشرہ اور قوم زوال پذیر ہو کر برباد
ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تخلیقی اقلیت مسخ کیوں ہو جاتی ہے۔ ٹوائن بی کی رائے
میں ہوتا یہ ہے کہ جب تک اقلیت واقعی نئے افکار اور اس کے نتیجے میں نئے ادارے
تخلیق کرتی رہتی ہے۔ تو اس کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ اقلیت نئے
افکار اور نئے ادارے تخلیق کرنا چھوڑ دیتی ہے اور پرانے افکار اور فرسودہ اداروں سے
لوگ بغاوت کر دیتے ہیں اور یہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں یا یہ فرسودہ ادارے کچھ
عرصہ تو قائم رہتے ہیں۔ لیکن ان کو قائم رکھنے والی طاقتیں اور جماعتیں مسخ ہو جاتی
ہیں۔ اور اپنی موت آپ مر جاتی ہیں اور ان دونوں صورتوں میں زوال یقینی ہے۔

تیسری صورت میں قوم کی تخلیقی صلاحیتیں جب مسخ ہو جاتی ہیں۔ تو وہ مختلف قسم
کے بت تراش لیتی ہے۔ اور ان کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ جس کا نتیجہ بھی محکومی اور
غلامی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

ایک بت فتح یا کامیابی کا ہوتا ہے۔ یعنی جب قوم ایک چیلنج کا مقابلہ کر لیتی ہے۔ تو
اس کی خوشی میں اس طرح سرشار ہو جاتی ہے کہ اسی کامیابی کا بت تراش کر کے اس کی پوجا
شروع کر دیتی ہے اور یہ یقین کر لیتی ہے کہ ہر بار اسے کامیابی ملے گی۔ جس کی وجہ

سلہ۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور، ۱۹۷۹، صفحہ ۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے وہ [illegible] اور معاشرہ کا [illegible] کمزور ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا [illegible] اس کو شکست [illegible] کر دیتا ہے۔

دوسرا بت قدیم اور روایتی اداروں کا ہوتا ہے۔ مثلاً ادارہ بادشاہت اور کلیسا۔ یہ بھی ان کی افادیت ایک زمانے میں مسلم تھی، لیکن جب انہوں نے بتوں کی صورت اختیار کر لی۔ اور لوگ ان کا احترام کر کے ان کو پوجنے لگے۔ تو ان بچاریوں کی شکست میں غلطی اور [illegible] آ گئی۔

تیسرا بت قدیم فنون کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم جو صدیوں قبل ایجاد ہوئے تھے۔ ان سے اسی طرح چمٹے رہا جائے۔ گویا کہ وہ مقدس ہیں، ان کی پوجا باعث سعادت ہے۔ اور دوسرے علوم، جن کے باعث آج دنیا کی باگ ڈور ہے ان سے بے اعتنائی برتی جائے۔

ٹائن بی کے نزدیک تہذیب کی شکست و انتشار کی علامتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تہذیب کے جسم (یا معاشرے) کی شکست۔ دوم۔ تہذیب کی روح کی شکست۔

کسی تہذیب کا جسم شکستہ ہو کر تین ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ غالب اقلیت خود کو منظم کر کے مختلف طبقوں جیسے کہ قانون داں، سرکاری افسران اور کچھ مفکروں کو ملا کر حکومت کرنے کا پروگرام بناتی ہے۔ اور اس کے روح رواں وہ افراد ہوتے ہیں۔ جو عوام کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اور جب عوام یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا مستقل استحصال کیا جاتا ہے۔ تو وہ غالب اقلیت سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور ہمسایہ تہذیبیں ان کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ اور اکثر اوقات حملہ آور ہو کر نقصان پہنچاتی ہیں۔

روح کی شکست سے مراد وہ انتشار و بدنظمی ہے۔ جو تہذیب کے ٹوٹتے وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دنیا بھر کی [illegible] ہیں ہوتیں [illegible] ختم ہونے کے بعد عام افراد کے فکر میں توازن برقرار نہیں [illegible] پیچھے پیچھے [illegible] انتہا [illegible] ثابت ہوا تھا۔
ذہن کے انقلاب کو [illegible] نتیجہ سمجھتے ہیں [illegible] اقلیتوں سے سرزد ہوا۔

تخلیقی اقلیت کا ذوق پست ہو کر عامیانہ ہو جاتا ہے۔ اور تو اور گی یہ پستی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ خواہ مذہب ہو اخلاق ہو خواہ تعلیم و تربیت
یہ [illegible] حقائق ہیں جنہیں آج کی علمی دنیا قوموں کے عروج و زوال کے سلسلے میں تسلیم کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام قوموں چاہے ان کی قومیت علاقے کی بنیاد پر ہو۔ چاہے نسل و ذات کی بنیاد پر ہو یا مذہب و عقیدے کی بنیاد پر انہوں نے اس وقت ترقی کی ہے۔ اور عام انسانوں پر اپنی برتری کا جہانگیری کا علم نصب کیا ہے۔ جب ان کی تخلیقی اقلیتوں نے ایسے اصول وضع کیے اور ضابطے بنائے، جنہوں نے پوری قوم کے خیالات احساسات اور ارادوں میں یکسانیت پیدا کر کے انہیں متحد کیا اور لوگوں کے معاشرتی وغیرہ معاشرتی مثبت و منفی رجحانات میں تصادم کو تیز تر کر کے انہیں اندھی تقلید و [illegible] کے غاروں سے نکال کر عقلیت و حقیقت شناسی کی ان وادیوں میں کھڑا کیا جہاں سے خاک نشینوں نے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈال دیں۔ صحراؤں و بیابانوں کو روند کر وہاں اپنی مہذب [illegible] قدم پر وقار بستیاں آباد کیں۔ سمندروں کی گہرائیوں میں اتر کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اور زمین کی تہوں کو کھود کر معاشرے کے استحکام کے ذرائع فراہم کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی سب سے ترقی یافتہ طاقتور اور پرشکوہ قومیں بن گئیں۔

لیکن تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اقوام عروج پر پہنچنے والی قوتیں انسانیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا محسوس نہیں کر سکتی۔ سماج کی ترقی یا خوشی میں جو کمی یا الجھن ہو اس دور
اور عمل کی صلاحیت سے تیار نہیں۔ یہ دن دو گنی رات چوگنی مادی ترقیاں تو کر
رہی ہیں۔ لیکن ترقی کے ساتھ ہی ساتھ ایسے تضادات اور الجھن پیدا ہو رہے ہیں۔ جو انسانیت
کے لئے بہت خطرناک ہو گئے ہیں۔ اور انسانی سماج کے لئے ناسور بن کر اس کو کسی پہلو
بے چینی سے تڑپا رہے ہیں۔

جبکہ وہ جو کہ ہر قوم وحی الٰہی کی رہنمائی کے ترقی کرتی ہیں ان کی سرفرازیوں
کا انحصار استحصالی قوتوں اور حیوانی خواہشات پر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سماج
کی اکثریت کے حصے میں صرف الجھنیں، مصیبتیں، دور پریشانیاں اور سرگردانیاں
ہی آتی ہیں۔

یہ سب تاریخ کے حقائق ہیں۔ لیکن تاریخ انسانی کی یادداشت ایک ایسے
دور کو بھی محفوظ کئے ہوئے ہے۔ جہاں قوم کی اکثریت کو عدل و انصاف
اور اخوت و مساوات ملا تھا۔ یہ دور ساتویں صدی میں اس وقت شروع ہوا
جب عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں لوگوں کو ایسے اصول و اقدار
سے روشناس کرایا جسے "اسلام" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جب ایک ذلیل، پسماندہ اور شکست خوردہ قوم نے اسلام کی روشنی میں اپنے وقت
کی للکار کو سمجھا اور اس کا جواب دینے کے لئے مادی اور ذہنی طور پر تیار ہو گئی تو دنیا
نے ایک ایسی طاقت اور قوم کے رستاخیز کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ جس نے عرب سماج کو
بلند اور بنا دیا۔ جس کی وجہ سے عربوں کے فکر و عمل میں وہ توانائی پیدا ہوئی کہ وہ
دنیا کی سب سے طاقت ور اور انصاف پسند قوم کہلائی۔ اور ان کا چرچا ساری دنیا
میں ہو گیا۔ جس کی وجہ سے "اسلام" کے ماننے والوں کی تعداد آج کی دنیا میں کروڑوں
تک پہنچ گئی ہے۔ جنہیں آج کل "مسلمان" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com